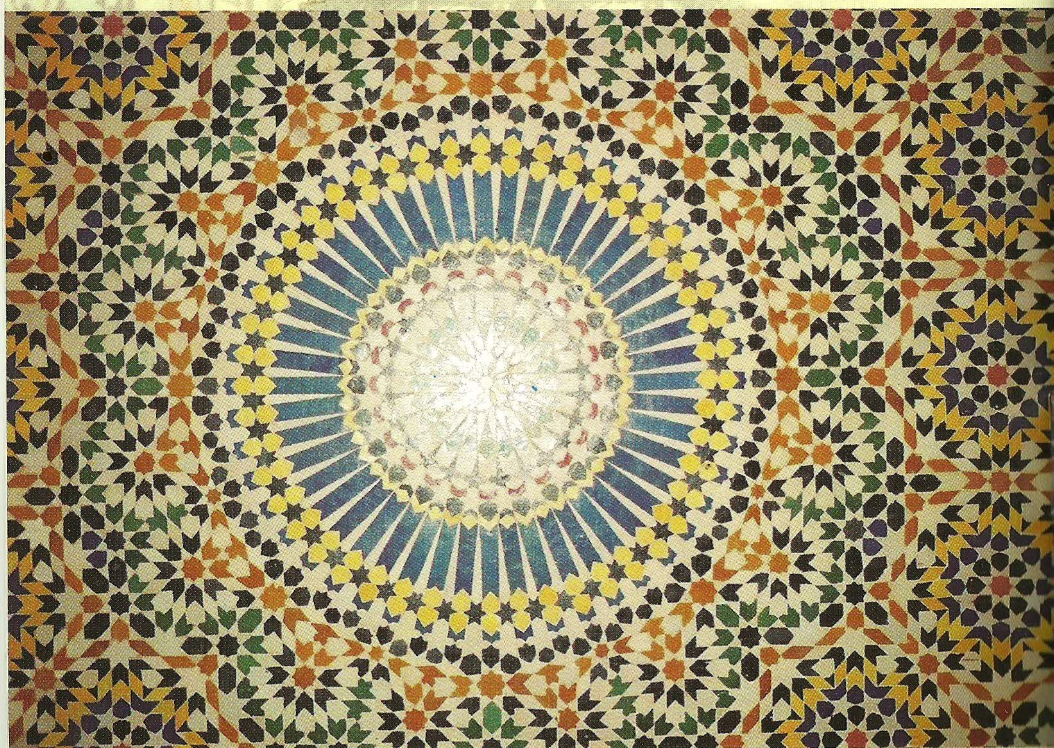
# نئے عہد کے دروازہ پر

مولانا وحید الدین خاں



ترتیب و پیش کش: شاہ عمران حسن

# نئے عہد
# کے
# دروازہ پر

## مولانا وحید الدّین خاں

ترتیب و پیش کش

**شاہ عمران حسن**

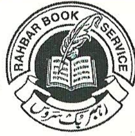
*Nae Ahd Ke Darwaze Per*
By Maulana Wahiduddin Khan

Compiled by
Shah Imran Hasan



First published 2009

Published by




RAHBAR BOOK SERVICE
Printer, Publisher & Distributer
C-24 Shaheen Bagh, Jamia Nagar
New Delhi - 110 025 (INDIA)
Mobile: +91-9810862382
+91-9716048296
E-mail: rahbarbookservice@gmail.com

Printed in India

بسم اللہ الرحمن الرحیم

سَنُرِيْهِمْ آيٰتِنَا فِى الآفَاقِ وَفِىْ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ
لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ (حٰم السجدة: 53)

ہم اُن کو اپنی نشانیاں دکھائیں گے، کائنات میں بھی اور اُن کے اپنے اندر بھی، یہاں تک کہ اُن پر کُھل جائے یہ واقعی برحق ہے۔

# آغاز کلام

زیرِ نظر کتاب ایک مقالے (thesis) پر مشتمل ہے۔ اِس کو 50 برس قبل مولانا وحیدالدین خاں صاحب نے تحریر کیا تھا اور جماعت اسلامی ہند کے ایک اجتماع بمقام امین الدولہ پارک، لکھنؤ میں 18-19 فروری 1955 کے درمیان پڑھا تھا۔ اس مقالے کو پیشگی طور پر اسلامی پبلشنگ ہاؤس، باقی منزل، اعظم گڑھ (یوپی) نے شائع کرایا تھا۔ اس لیے تقریر کے بعد جب یہ اعلان کیا گیا کہ مقالہ چھپی ہوئی صورت میں بک اسٹال پر موجود ہے تو لوگوں کا ہجوم اس کو لینے کے لیے اسٹال پر ٹوٹ پڑا تھا اور تمام مطبوعہ نسخے ہاٹ کیک کی طرح فروخت ہوگئے۔ اُسی زمانے میں اس کا ہندی اور انگریزی ایڈیشن بھی منظرِ عام پر آ گیا تھا۔ یہ مقالہ ہندی میں: ''نو یگ کے پرویش دوار پر'' اور انگریزی میں درج ذیل نام سے شائع ہوا:

On the Threshold of a New Era

یہ مولانا کی پہلی تحریر تھی جو کتابی شکل میں شائع ہوئی۔ اس کے بعد مولانا موصوف نے جدید الحاد اور افکار کے جواب میں عصری انداز میں کتابیں لکھنی شروع کیں اور بہت سی کتابیں تصنیف کیں۔ اِس کا سلسلہ بفضلہٖ تعالی ہنوز جاری ہے۔

زیرِ نظر کتاب کی اشاعت صرف ایک بار عمل میں آسکی۔ اگر چہ برابر اس کے تقاضے ہوتے رہے، مگر دوبارہ اس کی اشاعت ممکن نہ ہوسکی۔ اور پھر طویل وقت گزر جانے کے بعد یہ کتاب نایاب ہوگئی۔ میرے علم میں اس کتاب کا نام اپریل 2000 میں آیا تھا۔ میں نے اس کو ڈھونڈنا شروع کیا۔ اس کی تلاش وجستجو میں ابتداءً حوصلہ شکن تجربات ہوئے۔ لیکن میں نے ہمت نہیں ہاری اور اپنی کوشش جاری رکھی۔ بالآخر میں گذشتہ سات سال کی محنت ومشقت کے بعد اِس کتاب کو حاصل کرنے میں کامیاب ہوگیا۔

یہ میرے لیے بے حد خوشی کا موقع ہے کہ میری حقیر سی کوشش سے مولانا موصوف کی

ایک اہم اور تاریخی تحریر منظر عام پر آرہی ہے۔ یہ کتاب چوں کہ 50 سال قبل اُس زمانے کے حالات کے مدِ نظر لکھی گئی تھی، اس لیے اب اس میں سے بعض باتیں تبدیل ہوگئی ہیں یا بعض باتوں میں ترقی ہوگئی ہے۔ تاہم زیر نظر کتاب میں کسی قسم کی کوئی ترمیم نہیں کی گئی ہے، تاکہ اس کی تاریخی حیثیت برقرار رہے۔

نئی دہلی، 25 نومبر 2007 شاہ عمران حسن

# نئے عہد کے دروازہ پر

ہم ایک نئے عہد کے دروازہ پر کھڑے ہیں۔ مستقبل کے مورّخ اسے ایٹمی دور سے تعبیر کریں گے، یا آئندہ کوئی مورخ ہی نہ ہوگا جو انسانیت کی بربادی کی داستان قلم بند کرسکے۔ 2 دسمبر 1942 کو جس ایٹمی قوت پر انسان نے قابو حاصل کیا ہے، اس میں دنیا کے لیے زندگی ہے یا موت۔ یہ ایک عظیم قوت ہے، جس سے مفید کام لیے جائیں، تو خوشی اور فارغ البالی کی ایک نئی دنیا بسائی جاسکتی ہے۔ اندازہ کیا گیا ہے کہ یورینیم (Uranium) کے ایک ذرّے کے پھٹنے سے 10 کرور وولٹ (volt) کی طاقت حاصل ہوتی ہے۔ چٹکی بھر مادّے میں اتنی قوت پوشیدہ ہے کہ اس سے ایک ریل گاڑی ساری دنیا کے چکر کاٹ لے۔ جو کام آج کئی لاکھ ٹن کوئلے سے لیا جاتا ہے، وہ صرف ایک پونڈ یورینیم کے ذریعے ممکن ہے۔ مثلاً ایٹمی قوت سے چلنے والا ایک سمندری جہاز بمبئی سے روانہ ہو، تو وہ ساری دنیا کا سفر کرکے واپس آسکتا ہے۔ راستے میں اسے دوبارہ ایندھن (Fuel) لینے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ یہ قوت کا ایسا اتھاہ خزانہ ہے، جو انسان کو بجلی، تیل اور کوئلے سے بے نیاز کرکے نہایت سستے داموں سارے کام انجام دینے کے قابل بنا سکے گا۔ مگر اس قوت کا سب سے پہلا استعمال 6 اگست 1945 کو ایک خوف ناک بم کی شکل میں ہوا، جس نے 12 میل مربع رقبہ کے شہر ہیروشیما (Hiroshima) کو چند منٹ میں صفحۂ ہستی سے مٹا دیا۔ انسان اور حیوان اور درخت سب جَل بھُن کر خاک ہوگئے۔ صرف ایک ایٹمک بم کے نتیجے میں 7 لاکھ حادثے ہوئے، ایک لاکھ 26 ہزار موتیں واقع ہوئیں۔ جن میں 66 ہزار تو فوراً مر گئے اور باقی 60 ہزار نے زخموں سے سِسک سِسک کر جان دی۔ 10 ہزار لوگ ایسے تھے، جو فوراً بخارات میں تبدیل ہوگئے اور کئی میل دور تک مکانات دھماکے سے گر پڑے۔

یہ 10 سال پہلے کی بات تھی۔ اب اس طاقت سے جو بم بنائے گئے ہیں وہ اور بھی زیادہ

ہولناک ہیں۔ امریکا کی ایک تازہ ترین اطلاع میں بتایا گیا ہے کہ ان بموں کو اگر کوبالٹ (Cobalt) کے خول میں رکھ کر داغا جائے، تو اس سے نہایت طاقت ور ریڈیائی لہروں (Radio-Active) والا بادل پیدا ہوگا۔ یہ بادل ہوا کے ساتھ ساتھ ہزاروں میل تک پھیل جائے گا، اوران کے تباہ کُن اثرات سے کوئی جان دار چیز بچ نہ سکے گی۔

ایٹمی سائنس کے ماہر پروفیسر براؤن (Prof. Brown) نے کہا ہے کہ اگر اتحادیوں نے روس (Russia) اور چیکوسلواکیہ (Czechoslovakia/Czech Republic) کی سرحد پر کوبالٹ بم گرایا تو ڈیڑھ ہزار میل چوڑے اور تین ہزار میل لمبے علاقے میں کوئی ذی روح باقی نہ رہے گا، اور لینن گراڈ (Lenin Grade) سے اوڈیسا (Odessa) تک اور پراگ (Prague) سے کوہ یورال (Ural) تک موت کا سنّاٹا چھا جائے گا۔

شکاگو یونی ورسٹی کے پروفیسر لیوز لارڈ (Prof. Lewis Lord) نے بتایا کہ ایک ٹن والے چار سو کوبالٹ بم کے پھٹنے سے پوری زمین پر زندگی کا نام ونشان مٹ جائے گا اور صدیوں تک دنیا غیر آباد رہے گی۔

تیسری عالمی جنگ آج اسی طرح کے ایک خوفناک امکان کی حیثیت سے دنیا کے سر پر کھڑی ہے۔ اور اگر یہ جنگ ہوئی تو بقول ڈاکٹر رادھا کرشنن (وفات: 1975) ”یہ روس اور امریکا کی جنگ نہیں ہوگی، بلکہ دنیا کے عدم اور وجود کی جنگ ہوگی“۔ یہ وقت کا اہم ترین مسئلہ ہے، جس کا حل سوچنے میں دنیا کے بڑے بڑے لوگ لگے ہوئے ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ تمام ایٹم بم سمندروں میں ڈال دیے جائیں۔ مگر ظاہر ہے کہ جو لوگ کروروں اور اربوں نہیں بلکہ کھربوں روپیے خرچ کر کے یہ خطرناک ہتھیار بنا رہے ہیں، وہ کیا محض اتنا کہہ دینے سے انھیں سمندر میں پھینک دیں گے۔ کوئی کہتا ہے کہ عالمی حکومت قائم کرو۔ مگر دنیا کی مختلف قومیں جو ایک دوسرے کی دشمن ہو رہی ہیں، کیا ان کو ملا کر کوئی بین الاقوامی حکومت (international state) قائم کی جاسکتی ہے۔ کوئی شخص بقاءِ باہم (co-existance) کا اصول پیش کرتا ہے۔ مگر موجودہ حالات میں باہم مل کر رہنے کا نظریہ صرف روس

اور چین کے لیے قابل قبول ہے، جو اشتراکی (socialist) جماعتوں کے ذریعہ دنیا بھر میں اپنا جال بچھائے ہوئے ہیں، اور اپنے توسیعی ارادوں (programme of expansion) کے لیے جنگ سے زیادہ امن کے موسم کو مفید خیال کرتے ہیں — امریکا اور دوسرے جمہوری ممالک اس کو کسی طرح گوارا نہیں کر سکتے۔ کوئی صاحب فرماتے ہیں کہ دنیا کو امن اور جنگ میں سے ایک راستہ اختیار کرنا ہوگا۔ یہ تو ظاہر ہے کہ دو میں سے کوئی ایک ہی راستہ اختیار کیا جا سکتا ہے۔ مگر آپ وہ کون سا اصول پیش کر رہے ہیں، جس سے دنیا تباہی کے بجائے امن کی راہ اپنائے۔

سوچیے! کیا اس طرح کی باتیں حالات کو درست کر سکتی ہیں۔ دنیا سائنس کی حیرت انگیز دریافتوں سے زندگی حاصل کرنے کے بجائے خودکشی کا سامان تیار کرنے میں لگی ہوئی ہے۔ کیا یہ محض اس لیے ہے کہ اب تک کسی نے اس کے سامنے مذکورہ بالا قسم کی کوئی تجویز پیش نہیں کی تھی۔ اگر کوئی شخص ایسا سمجھتا ہے، تو وہ بہت بڑے دھوکے میں مبتلا ہے۔

یہ خوفناک صورت حال جو دنیا میں پیدا ہوگئی ہے، اس کی وجہ ہمارے نزدیک یہ ہے کہ آدمی ایک صحیح نظام کے بغیر زندگی گزار رہا ہے۔ اس کو لوہے اور بجلی کی سائنس تو آ گئی۔ اس نے وہ علم تو حاصل کر لیا، جس سے وہ مادّے (matter) کے جوہر (atom) کو پھاڑ سکے مگر خود اپنی سائنس سے وہ اب تک محروم ہے۔ سمندروں میں تیرنا اور فضا میں اڑنا اس نے سیکھ لیا، مگر وہ فن (art) اس نے نہیں جانا جس سے زندگی کی گاڑی چلا کرتی ہے، جس سے انسانی کوششوں کا رُخ متعین ہوتا ہے، جو ایک انسان اور دوسرے انسان، ایک قوم اور دوسری قوم کے درمیان حقوق و فرائض کا صحیح تعین کرتے ہیں۔ اس نے اتنی بڑی بڑی دوربینیں (telescopes) ایجاد کیں، جن کا حال یہ ہے کہ وہ 18 ہزار میل کے فاصلے پر جلتی ہوئی ایک موم بتی کو بھی دیکھ لیتی ہیں۔ مگر خود انسان کیا ہے اور دنیا کے اندر اس کی حیثیت کیا ہے، اس کو وہ اب تک نہ جان سکا۔

اس نے ایسی حسابی مشین (Eniac) بنائی، جو گھٹانے اور جوڑنے کے 10 ملین سوالات صرف پانچ منٹ میں مکمل کر دیتی ہے۔ سب سے پہلا سوال جو دوسری جنگ عظیم کے دوران اس مشین نے

صرف دو گھنٹے میں حل کیا، وہ اتنا بڑا تھا کہ اسے حل کرنے میں ریاضی کے دو تربیت یافتہ ماہروں کو 50 برس تک کام کرنا پڑتا۔ مگر خود انسانی زندگی کے مسائل وہ اب تک حل نہ کرسکا۔ ہر نیا ''ازم'' (ism) جو ایجاد کیا جاتا ہے، وہ مسائلِ زندگی کو کچھ اور الجھا دیتا ہے۔

اس نے سمندروں میں راستے بنائے، جن پر جہاز سفر کرتے ہیں۔ اس نے لوہے کی پٹریاں بچھائیں، جن پر ریلیں دوڑتی ہیں۔ اس نے تار اور بے تار برقی کا وہ عظیم سلسلہ قائم کیا جس پر انسان کی آواز اپنا راستہ بھولے بغیر ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچ جاتی ہے۔ مگر خود انسانی زندگی کے لیے راہِ عمل کیا ہو، وہ کس سمت میں چلے اور کس سمت جانے سے بچے، اس کا کوئی واضح نقشہ ابھی تک اسے نہیں ملا۔ اس نے ایسے اسٹیشن قائم کیے، جو فضا میں اڑنے والے ہوائی جہازوں کو کنٹرول کرتے ہیں۔ مگر انسان کو کنٹرول کرنے والا کوئی نظام وہ ابھی تک دریافت نہ کرسکا۔ اس نے ایسے قوانین بنائے، جو آٹو میٹک ٹیلی فون ایکسچینج (automatic telephone exchange) کے اندر لاکھوں کی تعداد میں پھیلے ہوئے تار کو نہایت باقاعدگی کے ساتھ باہم جوڑتے رہتے ہیں، مگر وہ ایک گھر کے دو قریب ترین آدمیوں کو بھی ایک رشتے میں باندھنے کا اصول معلوم نہ کرسکا۔ اور حالت یہ ہے کہ آج ایک عورت کسی مرد سے نکاح کرتی ہے اور کل اس لئے وہ طلاق لے لیتی ہے کہ رات کو مرد کے خراٹے کی آواز اسے پسند نہیں آئی۔

سفر اور مواصلات (communication) کے جدید ترین ذرائع نے ساری دنیا کو ایک کر دیا ہے۔ آپ ہوائی جہاز سے اڑ کر چند گھنٹوں میں ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچ سکتے ہیں۔ ایک شخص نیویارک میں ٹیلی فون اٹھا کر دنیا کے کسی بھی ملک کے آدمی سے بات کرسکتا ہے۔ مگر اس کے باوجود دریاؤں اور پہاڑوں کی حد بندی سے انسانیت آزاد نہیں ہوئی۔ سمندر کی مچھلیاں اٹلانٹک (Atlantic Ocean) سے بحر الکاہل (Pacific Ocean) اور بحر ہند (Indian Ocean) تک سفر کرتی ہیں اور ان میں کوئی جنگ برپا نہیں ہوتی۔ فضا کی چڑیاں ایک موسم ایشیا میں گزارتی ہیں اور دوسرے موسم میں وہ یورپ چلی جاتی ہیں۔ مگر ایک ملک کا آدمی دوسرے ملک کے لئے اجنبی کی حیثیت رکھتا ہے اور ایک قوم دوسری قوم کو ہڑپ کر لینا چاہتی ہے۔

دراصل یہی وہ سب سے بڑی کمی ہے جو آج ساری دنیا کو لاحق ہے۔ مشرق ہو یا مغرب، روس ہو یا امریکا سب کے سب اسی ایک چیز کے محتاج ہیں۔ دنیا کا مستقبل اب اسی ایک سوال پر منحصر ہے۔ اگر اس نے کوئی صحیح نظام پالیا ہو، تو یہ دنیا جنت کا نمونہ بن سکتی ہے اور اگر یہ نظام نہ ملا تو پھر کوئی چیز دنیا کو ایک ہولناک تباہی کے انجام سے نہیں بچاسکتی۔

نظامِ زندگی کا مسئلہ دراصل یہ مسئلہ ہے کہ آدمی کس طرح دنیا میں رہے، اس کی کوششوں کا رخ کیا ہو، اور وہ کون سی شخصیت ہو، جو مختلف انسانوں کے درمیان فیصلہ کرنے اور انھیں باہم جوڑے رکھنے کا کام کرے۔ مثلاً ریل گاڑی کو (1) ایک ڈرائیور کی ضرورت ہوتی ہے جو اس کو کنٹرول کرے۔ (2) ایک پٹری کی ضرورت ہوتی ہے جس پر وہ بھٹکے بغیر سفر کر سکے۔ (3) اور ایک طے شدہ منزل کی ضرورت ہوتی ہے، جس کی طرف وہ دوڑے۔ بس ان ہی تین چیزوں کا نام زندگی ہے۔ جس طرح ایک مشین کو اپنا کام صحیح طور پر انجام دینے کے لیے یہ تینوں چیزیں ضروری ہیں۔ اسی طرح انسان بھی اپنے مقصدِ وجود کو پورا نہیں کرسکتا، جب تک یہ چیزیں اسے حاصل نہ ہوں۔

(1) سب سے پہلا سوال یہ ہے کہ وہ کون سی شخصیت ہو، جو انسانوں کی اس وسیع آبادی کا انتظام کرے۔ اور جس کی سب لوگ اطاعت کریں۔ اور جس کو سب کے اوپر حاکمانہ اختیارات حاصل ہوں۔ یہی شخصیت وہ کنٹرولر (controller) ہوگی، جو ہمارے انجن کو قابو میں رکھ کر چلائے گی۔

(2) دوسری چیز یہ ہے کہ وہ کون سا قانون ہو جس کو سب لوگ تسلیم کریں، جس کے مطابق ایک شخص اور دوسرے شخص اور ایک گروہ اور دوسرے گروہ کے درمیان فیصلہ کیا جائے، جو انسانی سرگرمیوں کے صحیح حدود (limitations) متعین کرے، اور زندگی کے مختلف مراحل میں ایک رویّے کو چھوڑنے اور دوسرے رویّے کو اختیار کرنے کی ہدایات دے، یہ گویا وہ پٹری ہوگی جس پر انسانی زندگی کی گاڑی سفر کرے گی۔

(3) تیسری چیز یہ کہ ہم جو اس دنیا میں پیدا ہوئے ہیں تو ہمارے پیدا ہونے کا مقصد کیا ہے۔ وہ کون سی منزل ہے، جدھر ہم کو جانا چاہیے۔ کون سا کام کرنے میں ہمارے لیے بہتری ہے، اور کون

سے کام ہیں جن کو کرنے کی صورت میں ہمیں نقصان اٹھانا پڑے گا۔ اسی سے متعلق یہ سوال بھی ہے کہ مرنے کے بعد کیا ہوگا۔ اگر یہ زندگی مرکر ختم ہوجاتی ہے تب تو ہمیں اس کے بارے میں کچھ سوچنے کی ضرورت نہیں۔ لیکن موت کے اُس پار بھی اگر کوئی دنیا ہے، اور اس کے بعد بھی اگر زندگی کا سلسلہ باقی رہتا ہے، تو ہم کو آج ہی سے اس کے لیے بھی سوچنا ہوگا۔ کیوں کہ پھر یہ ہماری موجودہ زندگی، موت کے بعد آنے والی زندگی سے الگ نہیں ہوسکتی۔ ہماری آج کی کارگزاریوں کا اثر لازماً کل کے حالات پر پڑے گا۔

اس سوال کے صحیح جواب کے معنی یہ ہیں کہ ہم نے وہ منزل پالی ہے، جہاں پہنچ کر ہم کو اپنی زندگی کا مقصد حاصل ہوجائے گا۔ اگر ہم نے صحیح مقصد طے کیے بغیر اپنا سفر شروع کردیا تو اس کی مثال ایسی ہوگی کہ ایک شخص کلکتہ جانے کے ارادے سے ریلوے اسٹیشن میں داخل ہوا اور سامنے پلیٹ فارم پر ایک گاڑی کھڑی دیکھ کر اس میں بیٹھ جائے اور یہ معلوم نہ کرے کہ یہ گاڑی کہاں جارہی ہے۔ وہ اسی طرح انجان حالت میں سفر کرتا رہے، یہاں تک کہ ٹرین جب اپنے آخری اسٹیشن پر پہنچے تو معلوم ہو کہ یہ امرتسر ہے جو کلکتہ سے بالکل مخالف سمت میں ساڑھے گیارہ سو میل دور واقع ہے۔

ہم جس نظام کی دعوت لے کر اٹھے ہیں وہ اسلام ہے۔ دنیا کے مختلف نظاموں کے مطالعے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ اس آسمان کے نیچے یہی ایک نظام ہے جو زندگی کی گاڑی کو صحیح طور پر چلاسکتا ہے۔ اور اس کو وہاں پہنچا سکتا ہے جہاں یقیناً اسے پہنچنا ہے۔

اب میں بتاؤں گا کہ مندرجہ بالا تینوں بنیادی سوالات کا جواب اسلام کس طرح دیتا ہے اور دوسرے جوابات جو اس سلسلے میں دیے گیے ہیں، ان میں کیا خرابیاں ہیں۔

پہلے سوال کا صحیح جواب پانے کے لیے یہ دیکھنا ہوگا کہ اس کائنات کا کوئی خدا ہے۔ اگر کوئی ہے جس نے کائنات کو بنایا ہے اور جو اس پورے کارخانے کو چلا رہا ہے، تو لازماً اسی کو ہمارا بھی خدا ہونا چاہئے۔ پوری کائنات کا حاکم کوئی اور ہو، اور انسان پر کسی دوسرے کا حکم چلے، یہ بات عقل اور منطق کے بالکل خلاف ہے۔

یہ زمین جس پر ہم رہتے ہیں، آپ کو معلوم ہے کہ کسی ہاتھی کی پیٹھ پر نہیں رکھی ہوئی ہے، بلکہ وہ فضا میں معلق (suspended) ہے۔ زمین کی گولائی خط استوا (Latitude) پر 25 ہزار میل ہے۔ اس کے مقابلے میں سورج اتنا بڑا ہے کہ اگر اس کے ٹکڑے کیے جائیں تو اس سے ہماری زمین جیسی 12 لاکھ 34 ہزار زمینیں نکل سکتی ہیں۔ پھر یہ بڑائی بھی آخری بڑائی نہیں ہے۔ آسمان میں کتنے ستارے ایسے ہیں جو سورج سے ہزار گنا بڑے ہیں۔ ان کے علاوہ بے شمار ستارے ایسے ہیں جو موجودہ دور بینوں کی دسترس سے باہر ہیں اور جن کی وسعت کا اب تک کوئی اندازہ نہ کیا جاسکا۔ اس طرح کے اربوں اور کھربوں نہیں بلکہ لا تعداد ستارے فضا میں کسی سہارے کے بغیر ٹھہرے ہوئے ہیں اور جذب وکشش کے عظیم قانون کے تحت اربوں سال سے گردش کررہے ہیں۔ کیا یہ محض اتفاق (mere accident) ہے اور اس کے پیچھے کوئی قدرت نہیں ہے جو انھیں سنبھالے ہوئے ہو۔

زمین سے چاند کا فاصلہ 2 لاکھ 40 ہزار میل ہے اور سورج ہم سے 9 کرور 43 لاکھ میل دور ہے۔ کائنات کی وسعت کے اعتبار سے یہ فاصلہ بہت کم ہے۔ سورج اور چاند کے علاوہ کوئی ستارہ (star) یا سیارہ (planet) ہم سے اتنا قریب نہیں ہے۔ ہم سے قریب ترین جو ستارہ ہے وہ بھی اتنی دور ہے کہ اس کی روشنی زمین تک سوا چار سال میں پہنچتی ہے۔ واضح ہو کہ روشنی کی رفتار ایک لاکھ 86 ہزار میل فی سکنڈ ہے۔ یعنی اس ستارے کی روشنی 60 کھرب میل سالانہ کی رفتار سے مسلسل چلتی رہے تو وہ ہماری زمین تک 51 مہینے میں پہنچے گی۔ جب کہ سورج کی روشنی صرف 9 منٹ میں پہنچ جاتی ہے۔ یہ قریب ترین ستارے کا حال ہے۔ ورنہ بعض ستارے اور اکثر سحابیے (Nebulas) ہم سے اس قدر دور ہیں کہ ان کی روشنی ہم تک کروروں سال میں پہنچتی ہے، اور کتنے ستارے ایسے ہیں جن کی روشنی غالباً آج تک زمین پر نہیں پہنچی۔ حالاں کہ اس نے اپنا سفر اس وقت شروع کیا تھا جب کائنات کی ابتدا ہوئی تھی۔ اتنی لمبی چوڑی کائنات میں تمام دوسرے ستاروں کے خلاف سورج اور چاند کا ہم سے اس قدر قریب ہونا سخت حیرت انگیز ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو ایشیا اور یورپ اور افریقہ اور امریکا اور آسٹریلیا سب برفستان (ice-cap) ہوتے اور روئے زمین پر کوئی جان دار دکھائی نہ دیتا ـــــ پھر یہ کیا محض اتفاق ہے اور اس میں

کسی کا سوچا سمجھا ہوا ارادہ شامل نہیں ہے۔

امریکا کے بعض بحری افسروں نے جو سمندر کی پیمائش کر رہے تھے، ایک تجربہ کیا۔ انھوں نے موٹے شیشے کی کئی ہوا بند کھوکھلی گیندوں (vaccum ball) کو سمندر میں ڈالا۔ نکالنے پر معلوم ہوا کہ وہ پانی سے بھر گئی ہیں۔ خوردبین (microscope) سے دیکھا گیا تو شیشے کی سطح کے ٹوٹنے یا سوراخ ہونے کا کوئی نشان نہیں ملا۔ اس سے ثابت ہوا کہ پانی کے نیچے 15 ہزار فٹ کی گہرائی میں ایک مربع انچ پر اتنا دباؤ ہے کہ وہ ایک گھنٹہ سے کم وقفے میں پانی کو شیشے کی موٹی دیواروں سے گزار دیتا ہے۔ اب غور کیجیے کہ جب 15 ہزار فٹ کی گہرائی پر پانی کا دباؤ اس قدر ہے تو ان مقامات پر کتنے زور کا دباؤ پڑتا ہوگا جہاں سمندر 5 میل یا اس سے بھی زیادہ گہرے ہیں۔ چنانچہ یہ سمندر جو زمین کے تین چوتھائی حصہ میں پھیلے ہوئے ہیں، اپنی تہ کے نیچے مسلسل فواروں کی شکل میں زمین کے اندر پانی داخل کر رہے ہیں۔

زمین کا اندرونی حصہ جو 30-40 میل کے بعد شروع ہوتا ہے، نہایت گرم ہے۔ جب یہ پانی زمین کے اندر پہنچتا ہے تو وہ اندرونی حرارت سے بھاپ بن کر خارج ہو جاتا ہے۔ اگر کسی دن اوپری حصے کی طرح ساری زمین سرد ہو جائے تو جس طرح روئی یا جاذب کاغذ میں پانی جذب ہوتا ہے، اسی طرح وہ نہایت تیزی کے ساتھ زمین میں جذب ہونا شروع ہو جائے گا اور چند سو سال کے اندر سطح زمین سے اس طرح غائب ہوگا جس طرح وہ ریگستانوں سے غائب ہوا ہے۔ ایسی حالت میں ساری زمین غیر آباد اور ویران ہو کر رہ جائے گی اور ہر جگہ چاند جیسی خاموشی طاری ہوگی۔

پھر یہ کیا محض اتفاق ہے کہ انسانوں کو آباد کرنے کے لیے زمین کا اوپری حصہ ٹھنڈا اور اندرونی حصہ نہایت گرم ہے اور آسمان میں کبھی بالکل اچانک طور پر ایک نہایت چمک دار ستارہ دکھائی دیتا ہے جس کو نیا تارہ (Nava) کا نام دیا گیا ہے۔ موجودہ تحقیقات سے یہ ثابت ہوا ہے کہ یہ نئے ستارے نہیں ہوتے بلکہ پرانے دھیمے ستارے یک بیک بھڑک اٹھتے ہیں اور بڑھتے بڑھتے 20-25 ہزار آفتابوں کے برابر تیز روشنی سے چمکنے لگتے ہیں۔ اس طرح کا عمل مختلف ستاروں کے ساتھ ہوتا ہے مگر یہ

ستارے چوں کہ ہم سے بہت دور ہیں، اس لیے ہماری زندگی پر ان کا کوئی اثر نہیں پڑتا، مگر سورج جو ہم سے قریب کا ستارہ ہے اگر کسی دن تیز ہو کر بھڑک اٹھے تو اتنی شدید گرمی پیدا ہو کہ چند منٹ میں زمین سے ہر طرح کی زندگی کا خاتمہ ہو جائے گا۔

ماہر ارضیات لونکوئسٹ (Mr. Lencois) کا خیال ہے کہ ہر ستارہ 40 کرور سال میں ایک بار بھڑک اٹھتا ہے۔ سورج بھی ایک ستارہ ہے۔ جہاں تک ارضی تحقیقات کا تعلق ہے، کم از کم ایک ارب سال پہلے تک سورج کے بھڑکنے کا کچھ پتہ نہیں چلتا۔ پھر کیا یہ محض اتفاق ہے کہ جو عمل دوسرے ستاروں کے ساتھ ہو رہا ہے وہ سورج کے ساتھ نہیں ہوتا اور اس میں کسی بالاتر قوّت کا کوئی دخل نہیں ہے۔

زمین اور سورج دونوں اپنی اپنی کشش سے ایک دوسرے کو کھینچ رہے ہیں اور وہ ایک خاص مقام پر آکر رک گئے ہیں۔ اگر کسی دن ایسا ہو کہ زمین کی قوت کشش (gravitational force) ختم ہو جائے تو وہ پوری انسانی آبادی کو لیے ہوئے اپنے تمام بڑے بڑے شہروں اور کارخانوں کے ساتھ صرف 65 دن میں کھنچ کر سورج کے اندر جا گرے گی اور پھر دم بھر میں اس طرح جل کر راکھ ہو جائے گی جیسے کسی بہت بڑے الاؤ کے اندر ایک تنکا ڈال دیا جائے۔ مگر یہ دنیا کروروں سال سے آباد ہے اور پھر بھی یہاں ایسا نہیں ہوتا۔ کیا یہ محض اتفاق ہے اور اس کے پیچھے کوئی قدرت کام نہیں کر رہی ہے۔

رات کے وقت ٹوٹنے والے تارے آپ نے دیکھے ہوں گے۔ یہ دراصل سخت مادے کے ٹکڑے ہیں جو رائفل کی گولی سے سیکڑوں گنا زیادہ تیز رفتار ہونے کے ساتھ بے شمار تعداد میں ہر وقت فضا کے اندر دوڑتے رہتے ہیں۔ اور زمین کے گرد کرۂ ہوا (atmosphere) سے مسلسل ٹکراتے ہیں۔ ہوا کا کرہ ایک غلاف کی شکل میں تمام دنیا کو گھیرے ہوئے ہے۔ اس کی بلندی تقریباً 250 میل ہے۔ اس ہوا کی وجہ سے شہابِ ثاقب (Meteor) ہماری زمین تک پہنچ نہیں پاتے بلکہ وہ کرۂ ہوا کی بالائی سطح تک پہنچتے ہی ہوا کے ساتھ ٹکراتے ہیں اور اسی رگڑ کی وجہ سے اتنی حرارت پیدا ہوتی ہے کہ شہابِ ثاقب جل اٹھتے ہیں۔ یہی جلنے کی روشنی ہے جو ہم کو ٹوٹتے ہوئے تارے کی شکل میں نظر آتی ہے۔ اس ٹکراؤ سے شہابِ ثاقب پاش پاش ہو کر باریک ذرات کی شکل میں ہوا میں منتشر ہو جاتے

ہیں۔ یہ ہوا کا غلاف دنیا کے گرد نہ ہوتا تو شہاب ثاقب بہت بڑی تعداد میں نہایت شدت کے ساتھ زمین پر گرتے۔ ہم اُن کے خلاف کوئی بچاؤ نہیں کر سکتے تھے اور تھوڑے دنوں کے بعد ساری دنیا کا وہی انجام ہوتا جو ہیروشیما اور ناگاساکی کا ہو چکا ہے۔ چاند کی سطح پر جو بہت سے غار ہیں، خیال کیا جاتا ہے کہ یہ اسی قسم کے بڑے بڑے شہابیے (Meteors) کی بم باری سے پیدا ہوئے ہیں۔ پتھروں کی یہ خطرناک بارش جو ہر وقت فضا میں ہو رہی ہے، اس سے ہمارا بچے رہنا کیا محض ایک اتفاق ہے اور اس میں کسی انتظام کرنے والے کا انتظام شامل نہیں۔

کائنات کے اندر اس طرح کی بے شمار حقیقتیں اس بات کی گواہ ہیں کہ کوئی عظیم قوت ہے جو اس کائنات کو سنبھالے ہوئے ہے اور نہایت باقاعدگی کے ساتھ اس کا انتظام کر رہی ہے۔ کوئی شخص کیا محض اس لیے خدا کا انکار کر سکتا ہے کہ وہ کسی پہاڑ کی چوٹی پر بیٹھا ہوا نہیں ہے۔ جہاں جا کر وہ اسے دیکھ آئے، ایتھر (Ether) ایک ایسی چیز ہے جو ہر وقت اور ہر جگہ موجود ہے۔ جس پر ٹیلی ویژن کی تصویریں اور لاسلکی (wireless) کے پیغامات سفر کرتے ہیں۔ مگر کیا ایتھر کو کسی نے دیکھا ہے۔ وہ ایک ایسا لطیف عنصر ہے جس کا کوئی وزن نہیں۔ وہ نہ جگہ گھیرتا ہے اور نہ کسی خوردبین سے دیکھا جا سکتا ہے مگر سب لوگ اس کا وجود تسلیم کرتے ہیں۔

جو شخص یہ کہتا ہے کہ میں خدا کو اس وقت تک نہیں مانوں گا جب تک اپنی آنکھوں سے دیکھ نہ لوں، وہ گویا اس بات کا دعویٰ کرتا ہے کہ کائنات کی وسعتوں کو اس نے پار کر لیا ہے۔ جس کائنات کے بارے میں اب تک ہم یہ نہ جان سکے کہ وہ کتنی لمبی چوڑی ہے، ہم اس کے پیدا کرنے والے کا کس طرح احاطہ کر سکتے ہیں۔ سورج خدا کی ایک بہت چھوٹی سی مخلوق ہے مگر کروروں میل دور ہو کر اس کی روشنی کا یہ حال ہے کہ ہم اس پر نظر ٹھہرائیں تو ہماری آنکھ کی روشنی زائل ہو جائے۔ پھر وہ خدا جو ساری قوتوں کا خزانہ ہے۔ جو نہ صرف سورج بلکہ اس سے بڑے بڑے بے شمار ستاروں کو بھی روشنی اور حرارت پہنچا رہا ہے۔ کیا وہ ایسا ہی ہوگا کہ ہم اپنی آنکھوں سے اسے دیکھ لیں۔

خدا کو ماننے کے لیے خدا کو دیکھنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اس کو ہر جگہ اس کی حیرت انگیز کاری

گری میں ہم دیکھ سکتے ہیں۔ اس پھیلی ہوئی کائنات کا اس قدر منظم ہو کر چلنا اور اس کے مختلف عناصر میں باہم اس درجہ موافقت (harmony) ہونا، ایک خدا کی موجودگی کا سب سے بڑا ثبوت ہے۔

ہندستان میں ریلوے کا ایک چھوٹا سا نظام ہے جس کے راستوں کی لمبائی مجموعی طور پر 34 ہزار میل ہے اور جس کے انتظام کے لیے اِس وقت تقریباً سوا نو لاکھ آدمی ملازم ہیں۔ مگر اتنے سارے آدمیوں کی دیکھ بھال کے ساتھ اس مختصر سی لائن پر جو ٹرینیں دوڑتی ہیں، ان سے ہر سال تقریباً 25 ہزار حادثے ہوتے ہیں۔ مگر کائنات کا اتنا بڑا کارخانہ کروروں اور اربوں سال سے چل رہا ہے اور اس میں کوئی ٹکراؤ پیدا نہیں ہوتا۔ کیا یہ واقعہ اس بات کے ثبوت کے لیے کافی نہیں ہے کہ یہاں ایک زندہ قوت موجود ہے جو اپنے وسیع علم اور غیر معمولی اختیارات کے ذریعہ کائنات کے نظام کو چلا رہی ہے۔

یورپ میں سترھویں صدی عیسوی میں سائنس اور کلیسا (church) کا جو تصادم ہوا اور جس میں کلیسا نے بالکل غلط طور پر مذہب کا نام لے کر نئی سائنسی تحقیقات کو دبانے کے لیے نہایت وحشیانہ مظالم کیے۔ اس کے نتیجے میں سائنس دانوں کو مابعد الطبیعی نقطۂ نظر سے ایک ضد سی پیدا ہو گئی اور انھوں نے کوشش کی کہ کائنات کی تعبیر اس طرح کی جائے جس سے ثابت ہو کہ کلیسا کی بنیاد جس خدا کے تصور پر قائم ہے، اس کا کہیں وجود ہی نہیں ہے۔ اس کائنات کا کوئی چلانے والا نہیں ہے بلکہ وہ اپنے آپ ایک بے جان مشین کی طرح چلی جا رہی ہے۔ اسی زمانے میں لارڈ کیلون (Lord Kelvin) نے کہا تھا کہ جب تک میں کسی چیز کا مشینی ماڈل نہیں بنا لیتا تب تک میں اسے سمجھ نہیں سکتا۔ دمدار ستارے جو جاہل قوموں کے نزدیک سلطنتوں کے زوال اور شاہوں کے انتقال کا نشان سمجھے جاتے تھے، جب ان کی حرکت، تجاذب (gravitation) کے عالم گیر قانون کے مطابق ثابت کی گئی تو نیوٹن (Isaac Newton) نے کہا کہ کیا اچھا ہوا اگر دوسرے واقعاتِ قدرت بھی اسی قسم کے استدلال سے میکانی اصولوں (mechanical principles) کے ذریعے اخذ ہو سکیں۔

مگر یہ ایک جذباتی ردعمل تھا اور بہت جلد معلوم ہو گیا کہ کائنات کی صحیح توجیہہ (explanation) بن نہیں سکتی اگر اس کو صرف ایک بے دماغ مشین مان لیا جائے۔ چناں چہ اب بڑے بڑے سائنس داں

کائنات کے اندر ایک کارفرما قوت کو ماننے پر مجبور ہو رہے ہیں۔ مثال کے طور پر انگلستان کے مشہور سائنٹسٹ سر جیمس جینس (Sir James Jeans) نے اپنے ایک مضمون میں زمین اور آسمان کے حیرت انگیز نظام پر گفتگو کرتے ہوئے آخر میں لکھا ہے:

''کائنات ایک بہت بڑی مشین کے بجائے ایک بہت بڑے ذہن (mind) سے زیادہ مشابہ معلوم ہوتی ہے۔ مادے کے اس نظام میں دماغ اتفاقی طور پر محض ایک اجنبی کی حیثیت سے داخل نہیں ہو گیا ہے، بلکہ یہی غالباً مادے کے اِس نظام کو بنانے والا اور اس کے اوپر فرماں روائی کرنے والا ہے۔ پھر یہ دماغ یقیناً ایک عام انسان کے دماغ کی طرح نہیں ہے، بلکہ وہ ایسا دماغ ہے جس نے مادے کے جوہر (atoms) سے انسانی دماغ کی تخلیق کی ہے۔ اور یہ سب کچھ ایک اسکیم کی شکل میں اس کے ذہن میں پہلے سے موجود تھا'':

The Mysterious Universe, by Sir James Jeans, p. 137, 1938 (London)

یہی ''ذہن'' دراصل وہ عظیم اور برتر خدا ہے جو تمام انسانوں کا مالک اور ان کا حاکم ہے۔ ساری کائنات اسی خدا کی فرماں برداری میں لگی ہوئی ہے۔ پھر انسان کا راستہ کیوں کر اس سے الگ ہو سکتا ہے۔ ایک ریل گاڑی جو کسی تیز رفتار انجن کے ساتھ بندھی ہوئی دوڑی چلی جا رہی ہو، اس کا کوئی ایک ڈبہ اگر اپنے آپ کو اس سے الگ کر کے کوئی دوسرا راستہ بنانا چاہے تو اس کا انجام تباہی کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔ اس لیے ہمارے نزدیک صحیح ترین راستہ صرف یہ ہے کہ انسان بھی اسی ہستی کا مطیع ہو جائے جس کی اطاعت اس کے گرد و پیش کا سارا عالم کر رہا ہے۔ آسمان کے ستارے اگر جذب و کشش کے نظام سے اپنے آپ کو الگ کر لیں تو آپس میں وہ ٹکرا کر تباہ ہو جائیں اور ایک دن بھی ان کی زندگی باقی نہ رہے۔

یہی حال آج انسان کا ہے۔ اس نے پورے نظام کائنات سے بغاوت کر کے خدا کا حکم ماننے سے انکار کیا۔ اس نے وہ راستہ چھوڑ دیا جس پر مخلوقات کا پورا قافلہ چلا جا رہا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ انسانی زندگی میں سخت ابتری پیدا ہو گئی ہے۔ امن اور خوش حالی اور سکون کے الفاظ ڈکشنریوں میں لکھے ہوئے تو

ملتے ہیں اور لیڈروں کی زبان سے آئے دن سنے بھی جاتے ہیں، مگر واقعہ یہ ہے کہ دنیا اب ان نعمتوں سے محروم ہو چکی ہے۔ اور نہایت تیزی سے وہ ایک خوفناک انجام کی طرف دوڑی چلی جا رہی ہے۔

اس کا علاج صرف یہ ہے کہ آدمی اپنے خالق کی طرف پلٹ آئے۔ وہ اس کو اپنا حاکم اور فرماں روا تسلیم کرے اور اس رسی کو مضبوطی سے تھام لے جس کے علاوہ ایک مرکز پر جمع ہونے کا کوئی دوسرا ذریعہ نہیں ہے۔

جب کائنات کے اندر ہماری حیثیت یہ ہے کہ دوسری مخلوقات کی طرح ہم بھی خدا کی ایک مخلوق ہیں تو ہمارے لیے اس کے سوا اور کون سی راہ ہو سکتی ہے کہ دوسری مخلوقات جس طرح ہر آن خدا کی بندگی کر رہی ہیں، اسی طرح ہم بھی ایک وفادار رعایا کی طرح اپنے آقا کی بندگی میں لگ جائیں۔ انجن کے پیچھے لگے ہوئے ایک ڈبّے کے لیے کیا یہ بھی سوچنے کا موقع ہے کہ وہ کدھر جائے۔ اس کو تو اسی طرف جانا ہے جدھر اس کا انجن اسے لے جانا چاہتا ہو۔

ایک شخص ہوائی جہاز سے 5 میل کی بلندی پر اڑ رہا ہو اور پھر یکا یک یہ فیصلہ کرے کہ مجھے اس ہوائی جہاز کے ساتھ نہیں جانا ہے بلکہ خود اپنی مرضی کے مطابق چلنا ہے۔ یہ سوچ کر وہ ہوائی جہاز سے باہر کود پڑے تو اس کا کیا انجام ہوگا۔ فضا میں اگر کوئی شخص یہ عمل کرے تو دنیا اس کو پاگل کہے گی۔ کیوں کہ اس کا انجام فوراً سب کے سامنے آجاتا ہے۔ مگر زمین پر آدمی نے اپنی پوری زندگی کے لیے یہی طرز عمل اختیار کر لیا ہے۔ اس نے خدا کی بندگی چھوڑ کر خود اپنے نفس کی بندگی، شیطان کی بندگی، ملک اور قوم کی بندگی شروع کر دی ہے، مگر اس کا غلط ہونا کسی کی سمجھ میں نہیں آتا۔ کیوں کہ اس کا انجام دیکھنے کے لیے سر کی آنکھوں کی بجائے عقل کی آنکھوں کی ضرورت ہے۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ وہ کون سا قانون ہو جس کو ہم اپنی زندگی کا قانون بنائیں۔ جس خدا کا قانون اس اتھاہ فضا کے اندر بے شمار ستاروں اور سیّاروں کو منظّم کیے ہوئے ہے اور ان میں باہم ٹکراؤ نہیں ہونے دیتا، اس نے کیا انسانوں کو جوڑنے کے لیے کوئی قانون نہیں دیا۔ جس نے پودوں کو یہ سکھایا کہ وہ ہوا سے کاربن ڈائی آکسائڈ (carbondioxide) لیں اور آکسیجن (oxygen) خارج

کر دیں۔ سورج اور زمین سے اپنی خوراک حاصل کریں اور جو چیزیں ان کو نقصان پہنچانے والی ہوں، انھیں چھوڑ دیں۔ سورج اپنے شعلوں کی لپٹ سے زمین کو جلانا نہیں چاہتا اور زمین یہ کوشش نہیں کرتی کہ سمندروں کے پانی سے وہ سورج کو بجھا دے۔ اس نے کیا ایسا کوئی قاعدہ نہیں بنایا جس سے مختلف قومیں ایک دوسرے سے مل کر رہ سکیں اور ایک ملک اور دوسرے ملک میں جنگ کے بجائے صلح کے تعلقات ہوں۔

اس کا جواب یہ ہے کہ یقیناً خدا نے ہم کو ایسا قانون دیا ہے۔ اس نے انسانوں کی پیدائش کے وقت ہی سے پیغمبروں کا ایک سلسلہ قائم کیا جو بار بار دنیا میں آ کر خدا کا قانون اس کے بندوں تک پہنچاتے رہے، مگر ہمیشہ ایسا ہوا کہ پیغمبر کی وفات کے بعد غرض مند اور جاہ طلب انسانوں نے اس قانون کو بگاڑ دیا۔ یہاں تک کہ چھٹی صدی عیسوی میں خدا نے اپنے اس قانون کا آخری اور مکمل اڈیشن پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے بھیجا، جس کو ہم اسلام کہتے ہیں۔ مسلمان جو دنیا میں اس قانون کے حامل سمجھے جاتے ہیں، ان میں اگرچہ عملی اور اخلاقی اعتبار سے بہت بگاڑ پیدا ہو چکا ہے اور انھوں نے خود بھی اپنی زندگیوں میں اس کا بہت کم اثر باقی رکھا ہے، مگر جہاں تک اسلامی قانونِ حیات کا تعلق ہے وہ آج بھی اپنی پوری شکل میں موجود ہے اور ہر شخص اور قوم کے لیے یہ موقع ہے کہ اس کو اختیار کر کے وہ اپنے معاملات کو درست کر لے۔

آج دنیا کے لوگ جس نظریئے کے تحت زندگی گزار رہے ہیں، وہ انسانی قانون سازی کا نظریہ ہے۔ مختلف قوموں اور حکومتوں نے اپنی اپنی مرضی کے مطابق، خود ہی قوانین بنائے اور انھیں کے مطابق، وہ اپنے معاملات کو چلا رہے ہیں۔ چناں چہ دنیا میں سخت خلفشار (anarchy) برپا ہے اور زندگی کی کوئی کل بھی سیدھی نہیں جا رہی ہے، یہ انجام اس لیے ہے کہ انسان خود اپنے لیے قانون نہیں بنا سکتا۔

انسان خود غرض ہے، وہ اپنے کو اور دوسرے کو ایک نگاہ سے نہیں دیکھ سکتا۔ جو قانون بھی وہ بنائے گا، اس میں لازماً اس کے رجحانات شامل ہوں گے۔ مثال کے طور پر جنوبی افریقہ (South Africa) کی

حکومت نے یہ طے کیا ہے کہ وہاں گوروں اور کالوں کی بستیاں الگ الگ کردی جائیں۔ اس فیصلے کے تحت حبشیوں (Negro) کو زبردستی ان کے موجودہ گھروں اور جائداد سے بے دخل کر کے دور کے علاقوں میں بھیج دیا جائے گا۔ اور اس طرح نسلی امتیاز کی بنا پر لوگوں کو الگ الگ بسانے کی اسکیم پر تقریباً 4 ارب 32 کروڑ پونڈ خرچ ہوں گے۔

آزادی سے پہلے کانگریس برابر یہ وعدہ کر رہی تھی کہ آزاد ہندستان میں ہندستانی زبان (اردو اور ہندی) کے درمیان جو سرکاری زبان ہوگی وہ دونوں رسم الخط (script) میں لکھی جائے گی۔ پنڈت جواہرلال نہرو نے 1935 میں کہا تھا:

> ''مجھے اس بارے میں مطلق کوئی شبہہ نہیں کہ ہندستانی زبان آگے چل کر پورے ہندستان کی مشترکہ زبان بن جائے گی۔ رسم الخط کی مشکل حل کرنے کی کوئی صورت اس کے سوا نہیں ہے کہ فارسی اور دیوناگری دونوں کو سرکاری طور پر تسلیم کرلیا جائے اور لوگوں کو اس کی اجازت دی جائے کہ جس خط میں وہ چاہیں لکھیں'' (میری کہانی 1935، جلد 2، صفحہ 300)

مگر جب اقتدار بدلا اور ملک کے لیے قانون بنانے کا اختیار کانگریس کے ہاتھ میں آیا تو اس نے ہندستان کے کروروں باشندوں کی خواہش کے باوجود ہندی کو دیوناگری رسم الخط میں سرکاری زبان قرار دے دیا۔

انسان چوں کہ وسیع تر حقیقتوں کا علم نہیں رکھتا، وہ صرف سامنے کی چیزیں دیکھ سکتا ہے۔ اس لئے اس کے قانون میں بار بار تبدیلی کی ضرورت پیش آتی ہے اور خدا کے بندے ان کی قانون سازی کا تختۂ مشق بنے رہتے ہیں۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد 1945 میں انگلستان میں لیبر پارٹی برسر اقتدار آئی اور اس نے کوئلے اور لوہے کی صنعت کو قومی ملکیت (public sector) قرار دے دیا۔ مگر 1951 کے الکشن میں جب سر ونسٹن چرچل (Sir Winston Churchil) کی پارٹی غالب آگئی تو اس نے دوبارہ ان صنعتوں کو نجی ملکیت (private sector) میں واپس کر دیا۔

ہندستان کا دستور (constitution) جو بہترین اہلِ دماغ حضرات نے دنیا کے بہت سے دستوروں کو سامنے رکھ کر تقریباً تین سال کی کوششوں کے بعد بنایا تھا، ابھی صرف ایک سال ہوا تھا کہ اس میں ترمیم کی ضرورت پیش آ گئی۔ اور جون 1951 تک 10 دفعات میں ترمیمیں اور تین اضافے کیے جا چکے ہیں۔ جب یہ دستور بن رہا تھا، اس وقت سوشلسٹ پارٹی کے لیڈر مسٹر اشوک مہتا نے مطالبہ کیا تھا کہ اس کو سوشل ازم کی بنیادوں پر مرتب کیا جائے۔ مگر اس وقت اس کی ضرورت نہیں سمجھی گئی اور دفعہ 19 اور 31 پاس کر دی گئی، جس کی رو سے ذرائع پیداوار پر نجی ملکیت کو تسلیم کیا گیا اور یہ کہا گیا کہ کوئی جائداد کسی شخص سے قانونی حق کے بغیر نہیں لی جا سکتی۔ مگر چار سال کے بعد پنڈت جواہر لال نہرو (وفات: 1964) کو احساس ہوا کہ ہندستان کی منزل سوشل ازم (Socialism) ہونی چاہیے۔ چناں چہ مذکورہ بالا دفعات میں ترمیم (amendment) کی جا رہی ہے تاکہ نجی ملکیتوں پر کسی دستوری رکاوٹ کے بغیر حکومت قبضہ کر سکے۔

انسانی قانون سازی کی ایک صفت یہ بھی ہے کہ اس میں بے اعتدالی ہوتی ہے۔ وہ کبھی ایک چیز سے متاثر ہوتی ہے اور اس کی حد کو پہنچ جاتی ہے اور کبھی دوسری چیز سے متاثر ہوتی ہے اور اس کی انتہا کو نکل جاتی ہے۔ ہندستان کی مختلف ریاستوں میں آج کل اصلاح آراضی (land reform) کا بہت چرچا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ زمین داری اور جاگیرداری کا جو نظام عرصے سے وہاں چلا آ رہا تھا، اس میں بہت سی خرابیاں تھیں اور ان کی اصلاح ضروری تھی۔ مگر انسانی قانون سازی صرف خرابیوں کی اصلاح پر نہیں رکی بلکہ اس نے سرے سے زمین داری ہی کا خاتمہ کر دیا۔ اور اس سلسلے میں ایسے مضحکہ خیز قوانین بنائے جو حالات کو سدھارنے کے بجائے اس کو بگاڑنے میں مددگار ہو رہے ہیں۔ مثال کے طور پر یوپی خاتمۂ زمین داری قانون کی ایک دفعہ یہ ہے:

''ہر شخص جو 'یوپی لینڈ رفارمز ایکٹ' کے نفاذ (30 اکتوبر 1954) سے فوراً پہلے کسی کھیت کا ادیواسی (سیر یا کسی دوسری آراضی کا جوتنے والا) رہا ہو یا ایسا سمجھا جائے تو وہ اس تاریخ سے اس زمین کا سیر دار ہوگا اور اس کا قبضہ اس پر تسلیم کیا جائے گا۔ اور وہ تمام حقوق اور ذمے

داریاں جو پہلے سیر دار سے متعلق تھیں، اس قانون کے بموجب، اسے حاصل ہو جائیں گی''۔

(Uttar Pardesh Zamindari Abolition and Land Reform Act (1954) Section 240)

ہندستان میں پہلے بھی یہ قانون رائج تھا کہ جو شخص کھیت جوتے وہ اس کا سکمی ہو جاتا ہے۔ اس قانون کی وجہ سے ہمارے یہاں جھوٹ اور بددیانتی کا ایک مستقل سلسلہ قائم تھا۔ زمین دار (landlord)، اَسامیوں کو جوتنے کے لیے کھیت دیتے تھے اور پٹواریوں (village registrar) کو رشوت دے کر پڑتال اپنے نام کراتے تھے۔ مگر اس وقت کے قانون میں اس کی گنجائش تھی کہ زمین دار جب بھی چاہے، مقدمہ لڑکر کاشت کار کو اس کے کھیت سے بے دخل کر سکتا تھا۔ مگر اب بے دخلی کا سلسلہ ختم کر دیا گیا ہے، جو شخص کوئی کھیت جوت رہا ہے، وہ لازماً اس کھیت پر قابض سمجھا جائے گا۔

اس نئے قانون نے ہماری دیہی آبادی کو سازش، قتل اور مقدمے بازی کا اکھاڑا بنا دیا ہے۔ اس نے اخلاقی اور معاشی دونوں پہلوؤں سے ملک کو سخت نقصان پہنچایا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اگر مکان اور فرنیچر کرائے پر دئے جاسکتے ہیں اور اس میں کوئی قانونی رکاوٹ نہیں۔ اگر موٹر اور دوسری گاڑیاں کرائے پر چلائی جاسکتی ہیں اور قانون اس کی اجازت دیتا ہے تو زمین ہی کے معاملے میں آخر یہ انوکھا قانون بنانے کی کیا ضرورت ہے کہ اس کو کرائے پر یا بٹائی پر نہیں دیا جاسکتا، اگر دیا گیا تو ملکیت ختم ہو کر وہ جوتنے والے کی طرف منتقل ہو جائے گی۔

پھر انسان چوں کہ اس بات کا صحیح علم نہیں رکھتا کہ ایک خرابی کے پیدا ہونے کے اسباب کیا ہوتے ہیں۔ اس لیے اکثر ایسا ہوتا ہے کہ جس برائی کو روکنے کے لیے وہ قانون بناتا ہے، کسی دوسری شکل میں وہ خود اس کے اسباب کی پرورش کرتا ہے۔ ایسے کام جن کو عام طور پر دنیا میں برا سمجھا جاتا ہے، ان کے لیے تمام قوانین میں سزائیں مقرر ہیں، مگر اس کے باوجود ساری دنیا میں حالت یہ ہے کہ جرائم کی تعداد دن بدن بڑھتی جارہی ہے۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ آدمی ایک کھلی ہوئی برائی کو برائی سمجھتا ہے اور اس پر قانونی پابندی لگا دیتا ہے مگر اجتماعی زندگی میں وہ بہت سی چیزیں جو کسی شخص کو اس برائی کے لیے تیار کرنے کا سبب ہوتی ہیں ان کا قطعی علم چوں کہ انسان کو نہیں ہوتا، اس لئے ان کو وہ

کھلا چھوڑ دیتا ہے۔

مثال کے طور پر زنا ایک ایسا فعل ہے، جس کو ہر ملک کے قانون میں قابل سزا قرار دیا گیا ہے۔ مگر بے پردگی، سینما، فحش لٹریچر (pornography) اور رقص وموسیقی کے پروگرام، جو آدمی کو اس فعل کے لیے ابھارتے ہیں، ان کو نہ صرف جائز رکھا گیا ہے بلکہ حکومتیں باقاعدہ ان کی سرپرستی کرتی ہیں۔ ایک عورت بن سنور کر بے پردہ سینما دیکھنے جائے تو قانون اس کے لیے کوئی رکاوٹ نہیں ڈالتا۔ مگر رات کے ایک بجے جب وہ دوسرا شو دیکھ کر اکیلی گھر واپس جارہی ہو اور کسی سنسان سڑک پر ایک آدمی اس کو پکڑ لے تو قانون حرکت میں آجاتا ہے۔ کالجوں میں جوان لڑکے اور لڑکیاں پوری بے باکی کے ساتھ ایک ساتھ پڑھتے اور کھیلتے ہیں اور اس کو جدید تہذیب (modern culture) کی نشانی سمجھا جاتا ہے۔ مگر اس میل جول سے جب ایک طالب علم ایک طالبہ کو پسند کر لیتا ہے اور جب کسی رات کو دونوں کسی پارک میں بدکاری کرتے ہوئے پائے جاتے ہیں تو دونوں کالج سے نکال دیے جاتے ہیں۔ ایک خاتون سائیکل کے ذریعہ سارے ملک کے دورے پر نکلتی ہے تو اخباروں میں اس کی تصویر چھپتی ہے اور بڑے آب وتاب کے ساتھ اس کی خبریں شائع کی جاتی ہیں، مگر جب کسی سنسان راستہ سے گزرتے ہوئے کچھ نوجوان اسے پکڑ لیتے ہیں تو قانون انھیں جیل بھیج دیتا ہے۔ انسان کے بنائے ہوئے قوانین میں اس طرح کے خلا کا پایا جانا یقینی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قانون کی موٹی موٹی کتابوں کے باوجود کہیں بھی قانون کا منشا پورا نہیں ہو رہا ہے۔

مگر خدا کا قانون اس طرح کے تمام خرابیوں سے پاک ہے۔ خدا سارے انسانوں کا خدا ہے۔ اس کا کسی شخص سے کوئی ایسا تعلق نہیں ہے جو دوسرے شخص سے نہ ہو۔ اس لئے اس کے قانون میں کسی خاص ملک یا قوم سے طرف داری نہیں ہوسکتی۔ پھر خدا ہی وہ ہستی ہے جس نے سارے عالم کو بنایا ہے اس لیے اسی کو ہر چیز کی حقیقتوں کا صحیح علم ہے۔ اس کی قانون سازی صحیح ترین علم کی بنا پر ہوئی ہے نہ کہ محض قیاس اور تجربہ کی بنا پر۔ خدا ایک عظیم ہستی ہے جس کے بارے میں انسانوں کی طرح جذبات سے متاثر ہو جانے کا شبہہ نہیں کیا جاسکتا ہے۔ اس لیے اس کے قانون میں خودغرضی اور افراط

وتفریط نہیں ہوتی۔ خدا نے انسان کو بنایا ہے، اس لیے وہ اس کی نفسیات سے اچھی طرح واقف ہے۔ وہ خوب جانتا ہے کہ انسان کے اندر کیا کیا کمزوریاں ہیں۔ اس لیے اس کا قانون صرف اچھے اور برے کاموں کی فہرست دے کر ہی خاموش نہیں ہو جاتا، بلکہ ان اسباب کو نشو و نما دینے کا بھی انتظام کرتا ہے جو آدمی کو اچھے کام کے لیے اکساتے ہیں، اور ان اسباب کو ختم کر دینا چاہتا ہے جو آدمی کو برے کام کی طرف لے جاتے ہیں۔

غرض کہ یہ صحیح ترین قانون ہے جو قطعی علم کی بنیادوں پر زندگی کے تمام معاملات کے لیے احکام دیتا ہے اور وہ ان خرابیوں سے بالکل پاک ہے جو انسان کے بنائے ہوئے قوانین میں ملتی ہیں۔ تیسرا سوال یہ ہے کہ انسان کی منزل کیا ہے۔ یہ زندگی کیا محض چند دن کے لیے ہے جو مرنے کے بعد ختم ہو جائے گی۔ کیا موت کے بعد کوئی زندگی نہیں جس کے لیے ہمیں تیاری کرنے کی ضرورت ہو۔ واقعات کی منطق اس کے خلاف رہنمائی کرتی ہے۔ انسانی جسم کا تجزیہ کیا گیا تو معلوم ہوا کہ 12 عناصر ہیں جن سے مل کر آدمی کا جسم بنا ہے۔ ہائیڈروجن، آکسیجن، نائٹروجن، کاربن، فاسفورس، گندھک، کیلشیم، میگنیشیم، پوٹاشیم، سوڈیم، کلورین اور فولاد۔ یہی 12 چیزیں ہیں جن سے ننانوے فی صدی جسمِ انسانی کی ترکیب ہوتی ہے۔ ان کے علاوہ 3 عناصر (elements) اور ہیں جن کی ضرورت جسم کو برابر پڑتی ہے — آیوڈین، میگنیز اور تانبا۔

یہ عناصر جس مقدار میں جسم کے اندر موجود ہیں ان کا تخمینہ کر کے قیمت کا اندازہ کیا گیا تو 25 فرانک ہوئی۔ اس 25 فرانک کے مادّے سے انسان جیسی حیرت انگیز مخلوق کا بنانا کیا محض ایک کھیل ہے جو چند دن کے لیے کھیلا گیا ہے۔ ہم بولتے ہیں۔ بظاہر یہ بہت آسان سی بات ہے مگر کوئی چھوٹے سے چھوٹا حرف بولنے کے لیے بھی جسم انسانی کے اندر 70 نسوں (veins) کو حرکت کرنی پڑتی ہے۔ ہم دیکھتے اور سنتے ہیں، لیکن فضا کے اندر روشنی اور آواز کی لہریں پیدا ہونے کا عجیب و غریب انتظام نہ ہوتا تو ہم آنکھیں رکھ کر بھی اندھے ہوتے اور کان ہوتے ہوئے بھی ہمیں کچھ سنائی نہ دیتا۔ یہ خون جو ہم کو قوت اور زندگی بخشتا ہے۔ اس کو دل سے جسم کے مختلف

حصوں میں پہنچانے کے لیے جتنی شریانیں (arteries) ہیں اور پھر دل کی طرف واپس لانے کے لیے جو وریدیں (veins) ہیں، اگر ان کے سروں کو ایک دوسرے سے ملا کرناپا جائے تو 3 لاکھ 50 ہزار میل کی لمبائی ہوگی جو پوری زمین کے گرد چودہ بار لپیٹی جاسکتی ہے۔

پھر یہ دماغ جس سے ہم سوچتے ہیں اور جو 3 لاکھ سے زیادہ اعصابی تاروں کے ذریعہ پورے بدن کو کنٹرول کرتا ہے، کس قدر عجیب ہے۔ کیا یہ حیرت انگیز انسان بس اسی لیے ہے کہ چند سال دنیا میں زندگی گزارے اور اس کے بعد مر کر مٹی میں مل جائے۔ یہ انسان جس کی زندگی کے لئے ہوا اور پانی اور سورج کا انتظام کیا گیا ہے، جس کی ضرورتیں پوری کرنے کے لئے زمین میں بے شمار قسم کی چیزیں پیدا کی گئی ہیں، کیا اس کا انجام بس یہی ہے کہ وہ بچہ سے جوان ہو، پھر بوڑھا ہو، اور پھر ایک دن مر کر ختم ہو جائے۔

ایک اور پہلو سے دیکھئے، ایک شخص بہت نیک اور معقول ہے، مگر اس کی ساری زندگی تکلیف میں گزر جاتی ہے۔ وہ خود کسی کا مال نہیں چھینتا مگر دوسرے اس کے گھر میں چوری کرتے ہیں۔ وہ کسی کو تکلیف نہیں پہنچاتا مگر دوسروں سے اسے تکلیف اٹھانی پڑتی ہے۔ وہ جھوٹ نہیں بولتا مگر دوسرے اس پر جھوٹا الزام لگاتے ہیں۔ وہ جب عدالت میں دادرسی کے لیے جاتا ہے تو وہاں بھی دوسرے لوگ اپنے پیسے اور سفارش کے زور سے مقدمہ جیت جاتے ہیں اور الٹے اسی کو سزا ہو جاتی ہے۔ کیا اس ظلم کا کوئی انصاف نہیں ہوگا۔

کچھ لوگ اپنے ذہن سے ایک نظریہ گھڑتے ہیں اور اس کو نافذ کرنے کے لیے لاکھوں بندگانِ خدا کو قتل کر کے ان کی ملکیتیں چھین لیتے ہیں اور پورے ملک کو جیل خانہ کی زندگی گزارنے پر مجبور کرتے ہیں۔ کیا اِس کی کوئی بازپرس نہیں ہے، کچھ لوگ ملک کے نظم ونسق پر قابض ہو کر قدرت کے ذرائع کی اس انداز میں تحقیق کرتے ہیں کہ ان سے کیسے کیسے خطرناک ہتھیار بنائے جاسکتے ہیں۔ اور پھر بموں کی بارش سے پورے پورے شہروں اور ملکوں کو آگ میں بھون ڈالتے ہیں۔ کیا اس کی کوئی پوچھ ان سے نہیں ہوگی۔

کسی ملک میں چند سرمایہ داروں کے پاس اناج اور پھل کی کافی پیداوار ہوتی ہے، مگر وہ بھاؤ گرنے کے ڈر سے لاکھوں من پیداوار کو جلا ڈالتے ہیں یا سمندر میں پھینک دیتے ہیں۔ حالاں کہ خود

ان کے ملک میں اور ملک کے باہر بہت سے لوگ انھیں چیزوں کے لیے ترستے ہیں۔ کیا ایسی کوئی عدالت نہیں ہے جہاں انھیں اپنے اس فعل کا جواب دینا ہو۔

اس وقت دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے۔ اس کی ہم کوئی توجیہہ نہیں کر سکتے اگر ہم ایک ایسے دن کو تسلیم نہ کریں، جب کہ ایک ایک شخص اور ایک ایک قوم کی کارگزاریوں کی جانچ ہوگی۔ اور اس کے کارنامے کے مطابق، اس کو اچھا یا برا بدلہ دیا جائے گا۔ اس طرح کے ایک دن کو مانے بغیر یہ دنیا محض بچوں کا کھیل نظر آتی ہے۔

اس طرح کا ایک دن ماننا اس لئے بھی ضروری ہے کہ دنیا میں آدمی کو صحیح رویہ پر قائم رکھنے کے لیے اس کے سوا اور کوئی صورت نہیں ہے۔ اگر زندگی بس یہی دنیا کی زندگی ہے اور مرنے کے بعد کوئی حساب نہیں ہونے والا ہے تو پھر کیا ضرورت ہے کہ آدمی سچائی اور دیانت داری اختیار کرے، کیوں نہ اپنے فائدے کے لیے وہ جھوٹ بولے، کیوں نہ رشوت لے اور غبن کرے، کیوں نہ ایک قوم دوسری قوم پر ڈاکہ ڈالے۔ اس نظریہ کو نہ ماننے کے بعد پھر کوئی ایسا عامل (factor) باقی نہیں رہتا جو آدمی کو صحیح رویہ پر برقرار رکھنے کے لیے مجبور کر سکتا ہو، پھر یہ انسانی آبادی ایک جنگل میں تبدیل ہو جاتی ہے جہاں ایک جانور دوسرے جانور کو کھا جانا چاہتا ہے۔ اور کوئی فرد کسی اخلاقی اور انسانی ضابطے کا پابند نہیں ہے۔

اسلام کے یہ تین بنیادی اصول جن کی تشریح میں نے یہاں کی ہے، ان کے اوپر ایک پورا نظام زندگی تعمیر ہوتا ہے، جو بچپن سے لے کر موت تک انسان کی رہنمائی کرتا ہے۔ ہم گھر کے اندر اور گھر کے باہر کس طرح رہیں۔ ہمارے لین دین کا طریقہ کیا ہو۔ بڑے بڑے تجارتی معاملات کس طرح انجام پائیں۔ مختلف علوم وفنون کی تعلیم کیوں کر دی جائے۔ پبلک کے حقوق کیا ہیں۔ حکمرانوں کو کس طرح رہنا چاہئے۔ عدالتوں میں کون سا قانون چلے۔ حکومت کی پالیسی کیا ہو۔ دوسرے ملکوں اور قوموں سے کس طرح کے تعلقات رکھے جائیں۔ غرض زندگی کے ہر شعبے میں وہ نہایت واضح ہدایات دیتا ہے۔ جن کی بنیادوں پر ایک نہایت محکم سوسائٹی بنتی ہے۔ جو قومی غرور میں مبتلا نہیں ہوتی اور نہ اس کے اوپر

اقتدار کا نشہ سوار ہوتا۔ کیوں کہ وہ ایک بلند و برتر خدا کو ماننے والی ہوتی ہے۔ وہ اپنی مرضی کے مطابق من مانے قانون نہیں بنا سکتی۔ کیوں کہ وہ خدا کے قانون کی پابند ہوتی ہے اور بذات خود قانون سازی کا اختیار نہیں رکھتی۔ وہ جھوٹ اور فریب کے طریقہ پر نہیں چل سکتی کیوں کہ اسے یہ ڈر لگا ہوتا ہے کہ آخرت میں اس کا مالک اس سے باز پرس کرے گا۔ کیلی فورنیا (امریکا) میں ایک مکان تیار کیا گیا ہے جس کو جدید ترین سامانوں سے سجایا گیا ہے اور سارے کام مشینوں سے لینے کا انتظام اس کے اندر کیا گیا ہے، اِس مکان میں بچوں کی نگرانی کے لیے ماں باپ کو ان کے ساتھ ساتھ رہنا نہیں پڑتا، کیوں کہ ہر کمرے میں موجود ایک ٹیلی ویژن کے ذریعے ان کے والدین ہر وقت ان کو دیکھ سکتے ہیں اور معلوم کر سکتے ہیں کہ اِس وقت وہ کہاں ہیں اور کیا کر رہے ہیں۔

مگر اسلام کے نظریہ پر ایمان رکھنے والا آدمی صرف ایک گھر میں نہیں بلکہ ہر وقت اور ہر جگہ اپنے آپ کو خدا کے سامنے تصور کرتا ہے، اور ہر آن وہ خدا کی نگرانی میں زندگی بسر کرتا ہے۔ پھر اس سے زیادہ بااصول اور عہد کا پابند اور انصاف کرنے والا کون ہو سکتا ہے۔

# Bibliography


1. روزنامہ تسنیم، 14 جنوری 1955
2. سائنس، حیدرآباد، جوہری بم نمبر اکتوبر - نومبر 1945
3. روزنامہ قومی آواز، 14 اپریل 1954
4. رسالہ سائنس حیدرآباد، فائل نمبر 1946
5. روزنامہ قومی آواز 2 مئی 1951
6. میری کہانی، جلد 2، صفحہ 300، پنڈت جواہر لعل نہرو، 1935
7. روزنامہ قومی آواز، 19 جنوری 1955
8. ہفت روزہ ایشیا، لاہور 28 جنوری 1955

New Hand Book of the Heavens, by Hubert J. Bernhard .9

Times of India Year Book, 1955 .10

The Mysterious Universe, by Sir James Jeans, 1938 .11

Uttar Pradesh Zamindari Abolition and Land Reform Act .12
(1954) Section 240

”ذرا سوچئے! کیا یہ حیرت انگیز انسان بس اسی لیے ہے کہ چند سال دنیا میں زندگی گزارے اور اس کے بعد مر کر مٹی میں مل جائے۔ یہ انسان جس کی زندگی کے لئے ہوا اور پانی اور سورج کا انتظام کیا گیا ہے، جس کی ضرورتیں پوری کرنے کے لئے زمین میں بے شمار قسم کی چیزیں پیدا کی گئی ہیں، کیا اس کا انجام بس یہی ہے کہ وہ بچہ سے جوان ہو، پھر بوڑھا ہو، اور پھر ایک دن مر کر ختم ہو جائے۔“